اقبال اور کارل مارکس

ڈاکٹر عبدالمغنی

اقبال ایک ایسے دانشور تھے جو اپنی ایک خاص منظم فکر رکھتے تھے۔ اسی لئے ان کو مفکر اور فلسفی کہنا صحیح ہوگا۔ اقبال کی فکر کا تجزیہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت ہی مربوط، جامع اور وسیع و مکمل فکر ہے۔ اس لئے کہ انفس و آفاق اور قدیم و جدید علوم کا متنوع اور گہرا مطالعہ کر کے اقبال حیات و کائنات اور انسانیت کے متعلق چند واضح، معین اور قطعی نتائج تک پہنچے تھے۔ پھر قرآنِ حکیم کی صورت میں ان کا ایک سرچشمۂ علم تھا جسے وہ تمام علوم و فنون کی کلید سمجھتے تھے۔ درحقیقت اسی سرچشمے نے انھیں ایک مرکزِ فکر اور ایک معیارِ نظر عطا کیا تھا، جو ان کے تمام خیالات و تصوّرات کا محور (Nucleus of thought) تھا۔ اسی محور و مرکز سے وہ تمام فلسفیوں، مفکروں اور دانش وروں کے افکار کا مطالعہ کر کے ردو قبول اور اخذ و ترک کرتے تھے۔ وہ رسولِ کریمؐ کے سوا کسی سے شخصی طور پر نہ تو وابستہ ہیں اور نہ مرعوب۔ ان کا اپنا ذہن خود اتنا قوی اور موثر ہے کہ وہ اپنے خاص نقطۂ نظر سے مختلف نظریات کا بدرجۂ احسن جائزہ لیتے ہیں اور اپنے نظامِ فکر کے اجزا و عناصر کے طور پر ہر ایک کو اس کی مناسب و موزوں جگہ پر رکھتے ہیں۔ مختلف شخصیتوں اور نظریات کے ساتھ اقبال کا رویہ عام طور پر احترام کا ہے اور وہ سبھی کی خوبیوں کا برملا اعتراف کرتے ہیں، اگرچہ ان کی خامیوں سے بھی واقف ہیں اور جہاں ضروری سمجھتے ہیں ان پر بہت ہی گہری اور کاری تنقید کرتے ہیں۔ وہ ایک خودشناس اور حق آگاہ مبصر ہیں۔ ان کی بصیرت جرات و فراست دونوں پر مبنی ہے اور بہ یک وقت عقل و ایمان کا مجموعہ ہے:

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ — سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب‌نظراں (اقبالؔ)

اس طرح اقبال کے علم و دانش نے مشرق و مغرب کی طنابیں کھینچ کر ملادی ہیں اور ایک آفاقی نظام فکر مرتب کیا ہے جو قدیم و جدید کا شیرازہ یا عطر ہے۔

کارل مارکس سے اقبال کے تعلق کی نوعیت وہی ہے جو دوسرے غیر اسلامی مفکروں سے ان کے تعلق کی ہے۔ ضرب کلیم کے باب سیاسیاتِ مشرق و مغرب' میں کارل مارکس کی آواز' کے عنوان سے ایک فکر انگیز نظم اس طرح ہے:

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی، یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارہ پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش مریز و کجدار کی نمائش
جہانِ مغرب کے بتکدوں میں، کلیساؤں میں، مدرسوں میں
ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

یہ حکیم معاش، یورپ کے ماہرینِ اقتصادیات ہیں اور ان کو مخاطب کرنے والا کارل مارکس ہے، جو مغرب کے پورے فلسفۂ معاشیات کو 'خطوطِ خمدار کی نمائش' قرار دیتا ہے اور یہ مارکس ہی ہے جو مغربی نظامِ حیات کے تمام اداروں میں، 'ہوس کی خوں ریزیاں' اور 'عقل عیار کی نمائش' دیکھتا ہے۔ یہ بیانات جنھیں شاعر نے مارکس ہی کی طرف منسوب کیا ہے، عصر حاضر کے زوال آمادہ اور ظلم پسند مغرب کا پول کھولنے والے ہیں اور مارکس کے اپنے فلسفۂ حیات کے محرکات و اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک منفی و تخریبی صورتِ حال تاریخ کے ایک خاص لمحے میں اور ایک خاص خطے میں ایسی تھی جو ایک بنیادی اصلاحِ احوال اور مکمل انقلاب کا مطالبہ کر رہی تھی، اسی کے جواب میں امام اشتراکیت نے جدلیاتی مادیت کا نظریہ اور طبقاتی جنگ کا منصوبہ پیش کیا۔ یہ مارکسیت کا بالکل غیر جانبدارانہ، اصولی اور مثبت مطالعہ ہے۔ لیکن اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مارکس کا فلسفہ دراصل تاریخ کے بعض حالات کا ردِ عمل تھا اور ایک ماحول تک محدود تھا، لہٰذا اس کے اندر اصلیت اور آفاقیت دونوں کی کمی ہے۔ اس نظم میں مارکس کی تعریف نمایاں ہے اور تنقید مضمر۔ بہر حال، یہ مارکسی تصور کی بہت اچھی ترجمانی ہے۔

عصر حاضر میں مارکس کے فلسفے کے تاریخی رول پر اقبال نے ایک دوسری نظم 'اشتراکیت' میں بہت واضح تبصرہ کیا ہے:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ گفتار

اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور ! ۔۔۔ فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر ۔۔۔ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں ۔۔۔ اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک ۔۔۔ اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار (ضربِ کلیم)

حرفِ قل العفو، قرآن کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں درج ہے کہ جو لوگ رسولؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں انھیں جواب دیا جائے کہ ان کی ضروریات سے جو کچھ بچ رہے خرچ کر دیا جائے۔ یہ دراصل اسلام کے فلسفۂ معاش اور نظامِ معیشت کا کلیدی نکتہ ہے۔ اسلام نے اوّل تو ملکیت کو ایک عطیۂ خداوندی اور امانتِ الٰہی قرار دیا ہے، پھر آمدنی اور اخراجات دونوں میں حرام و حلال کی تمیز کی ہے اور حلال مال یا جائداد میں زکوٰۃ اور عشر کی تعیین کی ہے۔ اس کے بعد جمع شدہ جائز دولت کو وارثوں میں تقسیم کر دیا ہے اور لوگوں کو عام ہدایت دی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں اپنی ضروریات سے بچا ہوا مال زیادہ سے زیادہ خرچ کر کے اپنے ایمان کی صداقت کا ثبوت دیں تاکہ دولت بجائے مالداروں کے ضرورت مندوں کے درمیان مسلسل گردش کرتی رہے اور فرد و معاشرہ دونوں کی سلامتی و ترقی کا باعث ہو۔ یہ سب نکتے صریحاً آیاتِ قرآنی میں موجود ہیں اور ان سے بہتر غربت و افلاس کو دور کرنے اور محنت و مزدوری کا صلہ دینے کے لئے کسی نظریہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اقبال اشتراکیت کا خیر مقدم اس جہت سے کرتے ہیں کہ مغرب کے مظالم کے پیشِ نظر یہ وقت کی چیز ہے اور روحِ عصر اس کا تقاضہ کر رہی تھی مگر مسلمانوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں، قرآنِ حکیم تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل انسانی معیشت کے اس راز سے پردہ اٹھا چکا ہے جو نئے دور میں ایک نئے انداز سے افشا ہو رہا ہے، چنانچہ توقع ہے کہ مارکس کا اشتراکی تصورِ معاش اس حقیقت کی رونمائی کرے گا جو قرآن کے تاریخ ساز حکم 'قل العفو' میں مضمر ہے۔ اس سلسلے میں اشتراکیت کی پہلی کامیاب تجربہ گاہ 'بلشویک روس' کی کردار نگاری اقبال نے اس طرح کی ہے:

روش قضائے الٰہی کی ہے عجیب و غریب ۔۔۔ خبر نہیں کہ ضمیرِ جہاں میں ہے کیا بات
ہوئے ہیں کسرِ چلیپا کے واسطے مامور ۔۔۔ وہی کہ حفظِ چلیپا کو جانتے تھے نجات
یہ وحیِ دہریتِ روس پر ہوئی نازل ۔۔۔ کہ توڑ ڈال کلیساؤں کے لات و منات (ضربِ کلیم)

اب یہ بات صاف ہو گئی کہ اقبال کی نگاہ میں مارکسی کمیونزم درحقیقت ایک منفی قوت ہے

جس کا اصل رول عصرِ حاضر اور دنیا ئے جدید کی تاریخ میں یہ ہے کہ اس نے ظالم کلیسائی نظام کا خاتمہ اس خطے میں کردیا جو اپنے مسیحی عقاید میں سب سے کٹر (Orthodox) تھا۔ یہ اشارہ بازنطینی کلیسائی نظام کی طرف ہے جو رومی کلیسا کے نظام سے کہیں زیادہ سخت گیر تھا۔ اور جس کا مرکز روس بن گیا تھا۔ کلیسائی نظام فی الواقع زارشاہی کے تمام جبر و جفا کی ایک علامت ہے۔ اس لئے کہ ماقبل اشتراکیت کے روس میں مذہب و سیاست ایک دوسرے سے بالکل ہم آہنگ تھے اور زار کے سیاسی استبداد اور معاشی استحصال کی کھلی اور پوری تائید و حمایت کلیسا کی طرف سے ہوتی تھی جو ہر قسم کی برائیوں اور بے حیائیوں کا ایک قلعہ بن گیا تھا اور زارشاہی کے سارے گناہوں میں برابر کا شریک تھا۔ ہر قسم کے سیاسی، اخلاقی اور معاشی جرائم کے ساتھ کلیسائے روس کی یہی وہ شدید وابستگی تھی جس نے اس ملک کے کیمونسٹوں کو مذہب سے مطلقاً برہم کردیا، جبکہ دوسرے مغربی ممالک میں بھی کلیسا، خواہ وہ کیتھلک، پروٹسٹنٹ یا پیورٹن وغیرہ کسی بھی انداز کا ہو عوام الناس کی نگاہ میں جبر و ستم اور فحاشی و بدکاری کا اڈا بن گیا تھا۔ لہذا مغرب کے سبھی لادینی عناصر اپنے خطۂ ارض کے کلیسائی نظام کے ردِ عمل ہی میں مذہب کے مخالف ہوگئے۔ مارکس اور لینن کے سامنے بھی مذہب کا یہی کلیسائی نمونہ تھا جس سے برگشتہ ہوکر انھوں نے اپنے اصل معاشی منصوبے میں عقاید و اخلاق کو بھی شامل کرلیا اور معاشی و سیاسی اصلاح و انقلاب کے لئے ضروری سمجھا کہ حکومت و معیشت کے ساتھ ساتھ مذہب و اخلاق کو بھی اپنے حملوں کا ہدف بنائیں، یہی مفہوم ہے کلیساؤں کے لات و منات کو توڑ ڈالنے کا۔

اشتراکیت کے اس منفی رول کی بہترین تنقید جاوید نامہ کے ایک باب میں "پیغام افغانی با ملت روسیہ" کے عنوان سے دی گئی ہے، جس کے صرف چند مناسب موقع اشعار درج ذیل ہیں:

کہنہ شد افرنگ را آئین و دیں — سوئے آں دیرِ کہن دیگر مبیں
کردۂ کارِ خداونداں تمام — بگذر از لا جانبِ الا خرام
درگذر از لا اگر جویندۂ — تا رہِ اثبات گیری زندۂ

یہ اقبال کے خیال میں مارکسی اشتراکیت کی اصل خامی اور کمزوری ہے کہ وہ اپنے تاریخی عمل میں کلمۂ اسلام کے پہلے جزء "لا الٰہ" تک آکر رک گئی ہے اور اس نے تمام باطل خداؤں کا انکار

کر دیا ہے، خواہ وہ رنگ و نسل کے ہوں یا پاپائیت اور سرمایہ داری کے، مگر نفی کے بعد وہ اثبات کی طرف نہ بڑھ سکی اور کلمۂ اسلام کے دوسرے جزو "الا اللہ" کی منزل تک نہیں پہنچ سکی، چنانچہ خام اور ناقص رہ گئی، نتیجۃً نہ صرف اپنے مقاصد میں ناکام ہوئی بلکہ انسانیت کے لئے ایک زبردست فتنہ بن گئی۔ لہٰذا علامہ جمال الدین افغانی کے ذریعے اقبال نے اشتراکی روس کو پیغام دیا ہے کہ اگر وہ واقعی ایک سماجی انصاف اور انسانی مساوات پر مبنی عالمی معاشرہ قایم کرنا چاہتا ہے تو اسے "ام الکتاب" کی "اساس محکم" اختیار کرنی چاہئیے۔ لیکن اس اساس سے دور رہ کر کمیونزم نے روس میں بھی مکمل معاشی جمہوریت کے لئے اپنے بلند بانگ اور ہنگامہ خیز دعوے کی کوئی موثر دلیل فراہم نہ کی۔ "پیام مشرق" کی ایک نظم "موسیولینن و قیصر ولیم" میں قیصر ولیم کا لینن کو جواب اس معنی خیز اور عبرت انگیز شعر پر ختم ہوتا ہے:

نماند نازِ شیریں بے خریدار اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

یہی مفہوم اقبال کے اس شعر میں ادا ہوا ہے:

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا؟ طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

(غزل — بالِ جبریل)

اس سلسلے میں بنیادی طور پر اقبال کا موقف یہ ہے:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(غزل - بالِ جبریل)

خواہ سیاسی جمہوریت ہو یا سماجی یا معاشی یا کوئی اور نظامِ حیات:

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

(دین و سیاست - بالِ جبریل)

اسی پس منظر میں اشتراکی خیالات کی عکاس سمجھی جانے والی مشہور نظم "فرمانِ خدا" کے مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ بھی کیا جانا چاہئیے:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے ہٹا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

ان اشعار میں معاشی انصاف اور سماجی مساوات کے جو احساسات ہیں وہ ایک باخدا نظام کے عادلانہ کردار ہی سے منسوب کئے جا سکتے ہیں، جہاں تک ''چراغِ حرم و دیر'' بجھا دینے کا سوال ہے تو دوسرے ہی شعر میں اس سوال کا جواب مل جاتا ہے:

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو۔

یہ آواز خود خدا کی ہے، اس لئے کہ عنوانِ نظم کی قوسین میں دی ہوئی ذیلی سرخی کے لحاظ سے ''فرمانِ خدا (فرشتوں سے)'' ہے، یہ کوئی مارکس الینن کا خطاب اپنے کامریڈوں کے نام اور مذہب کے خلاف نہیں ہے، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا دنیائے انسانیت میں مذہب کی اصلیت واپس لانے اور مذہب کے نام پر پھیلائی ہوئی خرافات کو مٹا دینے کا حکم اپنے غیبی کارندوں کو دے رہا ہے، تاکہ کلیسائیت کے ہاتھوں ''خالق و مخلوق میں حائل'' ہونے والے پردے اٹھا دیے جائیں، ناانصافیوں کا دور ختم ہو اور ہر بندۂ خدا کو رب العالمین کا پیدا کیا ہوا رزق آزادی سے ملے۔ اس پوری نظم میں اگر کوئی چیز فی الواقع اشتراکی کہی جا سکتی ہے تو وہ اس کا اندازِ کلام ہے جس میں شدت کے ساتھ ساتھ تشدد کا احساس بھی ہے، لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ ''فرمانِ خدا'' ہے، ایک قادرِ مطلق کا حکم ہے جو اپنی دنیا کے ظالم امراء سے ناراض ہی نہیں، سخت برہم ہے اور گویا اس کا غضب اس سماج اور دور پر نازل ہو رہا ہے جس میں غریب بندگانِ خدا پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے ہیں۔ دراصل ''فرمانِ خدا'' کوئی بیانیہ نظم نہیں ہے یا اپنی جگہ مکمل بھی نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر قارئین نیز ناقدین غلطی سے سمجھتے ہیں، یہ ایک تمثیلی نظم کا دوسرا حصہ ہے، جب کہ اس کا پہلا حصہ بالِ جبریل میں اس کے اوپر اور قبل دیا ہوا ''فرشتوں کا گیت'' ہے:

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی — نقش گرِ ازل ترا نقش ہے 'ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ، میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام — عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی — آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

اسی رپورٹ کے جواب میں خالقِ کائنات نے 'فرمانِ خدا (فرشتوں کے نام) جاری کیا ہے سارا معاملہ اصلاً و حقیقتہً 'عشقِ گرہ کشائے' کے 'جوہرِ زندگی' اور عصرِ حاضر میں نئے سرے سے اس کے رکے ہوئے 'فیض' کو 'عام' کرنے کا ہے۔ اسی لئے زیرِ نظر مکالمے میں فرشتوں کو خدا کا جواب اس معنی خیز شعر پر ختم ہوتا ہے:

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے — آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

اشتراکی روس اسی طرح 'تہذیبِ نوی' کا ایک گہوارہ ہے جس طرح امریکہ یا فرانس یا انگلستان یا جرمنی وغیرہ اور اس ظالم گہوارے کو مسمار کرنے کے لئے 'آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو' کا حکم خداوندِ عالم فرشتوں کے نام جاری کر رہا ہے۔ اس حکم کا محرک و مقصود صاف صاف سمجھنے کے لئے اس خالص معاشی نظم کا مطالعہ کرنا چاہیئے:

الارضُ لِلّٰہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں — تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں؟

یہ خالص اسلام کے نقطۂ نظر سے دولت کے امانتِ الٰہی ہونے کا تصور ہے جو فرد کے ساتھ ساتھ ریاست کی ملکیت کے نظریئے کا بھی صریح ابطال کرتا ہے۔ اس طرح اقبال معیشت میں دولت کا اصل مالک خدا کو سمجھتے ہیں اور انسان کو صرف اس کا امین تصور کرتے ہیں، جب کہ مارکس کے خیال میں وہ سماج یا ریاست کی ملکیت ہے۔ لہٰذا مارکس کی ریاست یا سماج کے برخلاف اقبال

کے نزدیک، درحقیقت خدا کا خوف عدلِ اجتماعی کا ضامن ہے۔ اور خدا کا نظام ربوبیت تمام انسانوں کے درمیان بلا امتیاز دہ اخوت، و مساوات قائم کرتا ہے جس کی توقع مارکس ایک طبقے کی آمریت سے کرتا ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ عدل اجتماعی کا تصور رکھنے کے باوجود کمیونزم نے انکارِ خدا کر کے جس گم رہی کا ثبوت دیا ہے وہ اس کی ناواقفیت، نادانی اور ایک غلط ماحول کے خلاف انتہا پسندانہ ردِّعمل پر مبنی ہے۔ چناں چہ انھوں نے مارکس کے خوابوں کی تعبیر عمل کی دنیا میں نکالنے والے لینن کو خدا کے حضور میں باریاب کر کے خود اس کی زبان سے اعترافِ حقیقت کرا لیا ہے:

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات | حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے | ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

— — — — — — — — — —

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت | میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

— — — — — — — — — —

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی | مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے | حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں | گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے | سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت | پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس | کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم | حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت | احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

مغربی تہذیب و تمدن کی عبرت انگیز تصویر کشی اور خدا کی بارگاہ میں اپنی مجبوری کی معذرت کرنے کے بعد لینن نظم کے آخر میں خدا ہی سے فریاد کرتا ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں | ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ　　دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات!

(لینن (خدا کے حضور میں) - بالِ جبریل)

یہ نظم فی الواقع اشتراکی انقلاب کے اقدامات کا ایک جواز ہے جو خود اقدامات کرنے والے کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ لینن کے اس بیانِ صفائی میں اقبال کی پوری ہمدردی تائید اشتراکیت کے ساتھ ہے اور وہ اس کی منفی جہت سے کامیابی اور مثبت انداز اختیار کرنے میں ناکامی دونوں ہی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اپنے موضوع کے ساتھ فن کار کی ہمدردی اور اس کی کردار نگاری میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ ایک مفکر کی دوسرے مفکر کی طرف سے قدر شناسی بھی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال خاص حدود میں مارکس کے خوابوں کی عملی تعبیر کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن یہ ہمدردی اور پسندیدگی کسی پیرو یا ہم سفر کی نہیں ہے۔ ایک ناقد اور غیر جانب دار دانشور کی ہے جو اپنے موضوع کی خوبیوں کا اقرار کرتے ہوئے اس کی اس بنیادی خامی کی نشاندہی کرتا ہے جس کی بنا پر وہ اس کو قبول کرنے کی بجائے بالآخر رد کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت بالغانہ و عاقلانہ تشریح و تنقید ہے۔ اسی لیے اس کا اثر ایک غیر متعصب قاری کے دل پر تیر کی طرح ہوتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ شاعر اپنے موضوع کے تابع نہیں، اس پر حاوی ہے، ذہنی طور سے بلند تر ہے اور ایک باوقار و غم گسار مصلح کا درجہ رکھتا ہے۔

مارکس اور اس کے فلسفے کے متعلق اقبال کا آخری تبصرہ ان کے آخری مجموعۂ کلام 'ارمغانِ حجاز' کی پہلی اردو نظم 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' میں درج ہے جو ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ ایک تمثیلی نظم ہے جس میں ابلیس اور اس کے مشیران عصرِ حاضر کے احوال پر مکالمہ و مباحثہ کرتے ہیں اور موجودہ عالمی نظام کو سراسر ابلیسی نظام تصور کرتے ہوئے اس کے مستقبل کے متعلق کچھ اندیشوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جمہوریت کو ابلیسی نظام کے لیے ایک نئے چیلنج اور تازہ فتنے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے مگر پھر اس کو بادشاہت کا ایک بہروپ سمجھ کر رد کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ابلیس کا تیسرا مشیر اشتراکیت کے ظہور پر اپنے اضطراب کا اظہار کرتا ہے:

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب　　ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیمِ بے تجلی وہ مسیحِ بے صلیب　　نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز — مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد — توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

"کلیم بے تجلی" اور "مسیح بے صلیب" "پیغمبر نیست ولیکن دربغل دارد کتاب" کے خطابات و بیانات کارل مارکس کے لیے ہیں۔ یہ مارکس کی وہ بہترین کردارنگاری ہے جس سے بہتر مفکرِ اشتراکیت کے کسی حقیقت پسند مداح سے بھی متوقع نہیں، اور یہ صحیح کردارنگاری ہے۔ اس میں مارکس کی تعریف بھی ہے اور تنقید بھی، اس کی خوبی بھی اور خامی بھی۔ مارکس داس کیپٹال جیسی عہد آفریں کتاب کا مصنف ہے، لہٰذا "در بغل دارد کتاب" کا فقرہ اس کے بارے میں بالکل درست ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے متعلق "نیست پیغمبر" کا فقرہ اوّل تو ایک بیانِ واقعہ ہے اس لیے کہ جو خدا اور مذہب ہی کو نہ مانتا ہو، وہ پیغمبر کس کا ہوگا؟ دوسرے مارکس کی حقیقی پیغمبری سے اس انکار میں اس کی مصنوعی پیغمبری کا طنز آمیز اقرار بھی پنہاں ہے، اس لیے کہ اس کے پیروؤں نے اس کو عملاً ایک پیغمبری جیسا درجہ دے دیا اور خود اس کی امت بن گئے، لہٰذا اس کی کتاب کو بھی انھوں نے مقدس وحی سمجھ لیا۔ چنانچہ اس انکار کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ مارکس ایک جھوٹا پیغمبر ہے اور اس کی کتاب ایک جعلی وحی ہے، جب کہ اس کی امت فریب میں مبتلا ہے۔ اسی طرح "کلیم بے تجلی" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہودی النسل مارکس نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰؑ کی طرح حقیقت کو بے نقاب دیکھنا چاہا اور رازِ حیات فاش کرنے کی کوشش کی، مگر اپنے بلند افکار کے طور پر چڑھنے کے باوجود وہ کلیم اللہؑ کی طرح تجلی سے شادکام و سرفراز نہ ہو سکا، اس نے بھی گویا خدا سے اپنا سا کلام کیا اور ربِّ کائنات سے ایک جلوۂ بے نقاب طلب کیا، اس لیے کہ اس نے اسرارِ زندگی پر پڑے ہوئے پردے اٹھانے کی اپنی سی کوشش کی اور اپنے خیالات انکشافِ راز کے طور پر پیش کیے، لیکن اسے جواب نہ ملا، خدا نے اس سے کلام نہ کیا، نہ اسے اپنا جلوہ دکھایا، لہٰذا وہ جو عین الیقین کے انداز سے تاریخ کے حقائق کا جائزہ لیتا اور جدید انسانی معاشرے کے لیے ایک دستورِ حیات تجویز کرتا ہے وہ غلط اور مغالطہ آمیز ہے۔ مارکس کے ضمیر پر کوئی انکشافِ حق ہوا ہی نہیں، اس نے حقیقت و صداقت کا رخِ زیبا دیکھا ہی نہیں، چناں چہ حکیمانہ تجزیۂ تاریخ کا اس کا یا اس کے بارے میں دعویٰ بلا دلیل اور باطل

ہے۔ اس کے "مسیحِ بے صلیب" ہونے کا مفہوم بھی ایسا ہی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی مانند مارکس نے اپنے وقت اور ماحول کے امراض کی مسیحائی کا دعویٰ کیا، لیکن ایک تاریخی دلیل کے طور پر اس کے لئے کوئی صلیب نہ کھڑی کی گئی اور اسے اس ابتلا سے نہ گزرنا پڑا جو ہر سچے رسول یا محسن انسانیت کی شناخت کا وسیلہ ہے۔ بہر حال، ان تحفظات کے باوجود مارکس کے انقلابی فلسفۂ معاشیات کا زبردست اعتراف اس کی تحریک کو "مشرق و مغرب" کی قوموں کے لئے روزِ حساب قرار دے کر کیا گیا ہے۔ اس سے بھی بڑا اعتراف حریت کی یہ لہر ہے کہ

توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

چوتھے مشیر کی مداخلت کے بعد تیسرا مشیر اپنے مخصوص انداز میں اور خاص رد عمل کے مطابق مارکس کے ایک اور زبردست اثر کا اقرار کرتا ہے:

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب

اس کے بعد پانچواں مشیر اپنے شیطانی کردار کے لحاظ سے گویا مارکس کی شان میں دو قصیدہ پڑھتا ہے۔

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر، وہ روحِ مزدک کا بروز ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

یہ مارکس کا شکوہ ہے ابلیس کے حضور میں ایک شیطانی مشیر کی جانب سے اس لئے اس میں جو تمثیلی طنز (drawmatic irony) مضمر ہے وہ نامۂ الزام (Charge-sheet) کو ایک قصیدہ قارئین کے نقطۂ نظر سے بنا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مذکورہ بالا اشعار سے زیادہ شاعرانہ اور پر زور و پر اثر خراجِ عقیدت کسی مارکسی شاعر نے بھی مارکس کو ادا نہ کیا ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ سب کچھ ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے ادا ہو رہا ہے اور مارکس کو

ابلیس کے رقیب کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے، جب کہ یہ رقابت باطل کی راہ میں مسابقت پر مبنی ہے، جیسا کہ محولہ بالا آخری شعر سے بالکل واضح ہے۔ یہ نکتہ نظم کے آخر میں ابلیس کے جواب سے بھی عیاں ہوتا ہے۔ وہ مارکس اور اس کی تحریک کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے:

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک — مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد — یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

پانچویں مشیر نے مارکس کو 'روحِ مزدک کا بروز' کہا تھا اور اسی اعتبار سے 'یہودی فتنہ گر' کی پھبتی اس پر کسی تھی۔ اب ابلیس خود بھی مارکس کے سارے فلسفے کو غیر فطری 'مزدکی منطق' یعنی ایک نئی بوتل میں دورِ قدیم کے ایران کے گم کردہ راہ مفکر 'مزدک' کی فکر کی پرانی شراب کہہ کر رد کر دیتا ہے، پھر اشتراکیوں پر وہ پھبتی کستا ہے جو اردو دنیا میں مشہور و معروف ہے۔ ابلیس کمیونزم کو خاطر میں نہیں لاتا اور اشتراکیوں سے مرعوب ہونے کی بجائے انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس لئے کہ اس کے خیال میں ان کے دل و دماغ پراگندہ ہیں اور ان کی ساری دوڑ بھاگ یا اچھل کود کچھ مایوس (frustrated) قسم کے لوگوں کی ایک بے معنی حرکت ہے۔ یقیناً یہ تمثیلی نظم میں اس کے ایک، بلکہ کلیدی کردار کا نقطۂ نظر ہے اور وہ اپنے ایک حریف پر حملہ کر رہا ہے۔ لیکن اس کے بعد ابلیس جو کچھ کہتا ہے اور جس طرح ابلیسی نظام کو حقیقی خطرے کی نشاندہی کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ صرف شیطانِ اعظم کے اظہارِ خیال یا تمثیل کی کردار نگاری کا نہیں ہے، بلکہ یہ تمثیل کے مصنف 'اقبال' کا نقطۂ نظر ہے جو کلیدی کردار کی زبانی ظاہر ہو رہا ہے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

— — — — — — — — — — — —

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے — مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

— — — — — — — — — — — —

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین

یہ وہی بات ہے جو بالِ جبریل کی نظم "الارض للہ" میں اقبال نے خود اپنے خاص انداز میں کہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال اپنے دور کے مغرب کے پورے نظامِ تمدن و تہذیب سے مایوس تھے اور سمجھتے تھے کہ زندگی کے ہر شعبے کے لئے یہ نظام مہلک ہے اور اس کے غلط اصول و اقدار انسانیت کی تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔ لہٰذا اقبال کو کسی ایسے نظریہ و نظام اور اس کی تعمیل کے لئے ایک ایسی تجربہ گاہ کی جستجو تھی جو عصرِ حاضر کے انسان کو تباہی سے بچا کر اسے حقیقی اور مکمل تعمیر و ترقی کا راستہ دکھا سکے۔ اسی جستجو میں انھوں نے بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں روس کے افق سے ابھرنے والی اشتراکیت کا خیر مقدم کیا، لیکن بہت جلد ان پر واضح ہو گیا کہ یہ فقط ایک "سرابِ رنگ و بو" تھا۔ چناں چہ دوسری چوتھائی میں انھوں نے امریکی جمہوریت کے ابھار سے توقع قائم کی، جیسا کہ "پیامِ مشرق" کے اردو دیباچے سے ثابت ہے جو انھوں نے خود نثر میں لکھا ہے اور جس میں انسانیت کے حال و مستقبل کا جائزہ لیا ہے۔ اگر اقبال زندہ رہتے تو دوسری جنگِ عظیم کے چند سال بعد رونما ہونے والی امریکی سیاست سے اسی طرح نالاں ہوتے جس طرح پہلی جنگ کے بعد وہ روسی سیاست سے بیزار ہو گئے تھے۔ ویسے مغربی جمہوریت، امریکہ جس کی ایک نئی تجربہ گاہ بنا تھا وہ بہت قبل سے اپنے خاص معیار سے رد کر چکے تھے۔ اقبال کا یہ معیار اسلام ہے، جو سرمایہ داری کا اتنا ہی مخالف ہے جتنا اشتراکیت کا۔ واقعہ یہ ہے کہ مغربی معاشرت کی جن خرابیوں کی اقبال مذمت کرتے ہیں وہ روس اور امریکہ دونوں کی سماجی زندگی میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں اور معیشت و سیاست کے دائروں میں بھی دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان عام انسان کے لئے کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اخلاقی اعتبار سے اقبال کی نگاہ میں پورا مغرب بہ شمول امریکہ و روس مجرم ہے۔ لہٰذا مارکس سے اقبال کا تاثر جزوی و تنقیدی ہے اور انھوں نے اس کے افکار کو خام مواد کے طور پر اپنی پختہ اسلامی فکر کا جدید نظام ترتیب دینے کے لئے اسی طرح استعمال کیا ہے جس طرح قدیم و جدید ادوار کے تمام مشرقی و صاحب نظران، اور جدید یکیانِ فرنگ کے خیالات کو۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا دماغ مارکس کے دماغ سے زیادہ محیط اور مربوط ہے۔

ممکن ہے اس کی وجہ قرآن سے اقبال کا تاثر اور مارکس کی بے خبری رہی ہو۔ مارکس نے ایک کتاب ضرور تصنیف کی لیکن اپنے نسلی تعصب کے سبب ام الکتاب کا مطالعہ نہ کیا جب کہ اقبال نے کتاب الٰہی کا مطالعہ کر کے ایک بہتر اور مفید تر فلسفۂ حیات کی ترجمانی کی۔

یہ فرق ہے اسلام اور اشتراکیت یعنی ایمان اور الحاد کا۔ اقبال کی آرزوؤں کا اسلامی انقلاب جب کبھی دنیا میں ہوگا اس وقت مارکس کی عالمی اشتراکیت صرف تاریخ کی ایک یادبن کر رہ جائے گی۔

●●

ماہنامہ **مریخ** پٹنہ

نئی آب و تاب کے ساتھ دوبارہ یکم اکتوبر ۸۳ء کو منظر عام پر آچکا ہے، معیاری، عام فہم اور دلچسپ تخلیقات، پابند نظمیں، غزلیں، قصہ و ماجرا سے بھرپور افسانے، واضح اور سلیس تنقیدی مضامین، ان کے علاوہ اردو زبان کے مسائل و اخبار، قیمت فی پرچہ دو روپے، سالانہ بیس روپے، بیرون شہر ایجنٹ وی پی طلب کریں یا زر ضمانت جمع کریں، معقول کمیشن دیا جائے گا۔ مشتہرین کے لئے مناسب نرخ۔

ایڈیٹر عبد المغنی، پتہ دفتر انجمن ترقی اردو بہار
لیڈی امام ہاؤس، پتھر کی مسجد، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

حجاب پرنٹنگ سینٹر

بیرون دہلی کے پبلشرز کے لئے خوشخبری

اگر آپ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے ہی اچھی اور عمدہ، مناسب اور کم لاگت پر کتابیں۔ کتابت، طباعت اور بائنڈنگ کے مرحلے سے گزر کر آپ تک پہنچ جائیں تو ہم سے رابطہ قائم کریں۔ ہم آپ کا کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیں گے۔

پتہ: حجاب پرنٹنگ سینٹر
۱۸۷۰ — گلی پتے والی، سوئیوالان، نئی دہلی ۲